ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.1(2024)
(January to March)

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں انسانی تذلیل کی پیشکش کا تجزیاتی مطالعہ (سماجی اور اقتصادی تناظر میں)

An Analytical Study of the Presentation of Humiliation in Ahmed Nadeem Qasmi's short stories (Social and Economic Perspectives)

ڈاکٹر سونیا بشیر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی کالج برائے خواتین، عبدالولی خان یونیورسٹی، مردان

Dr. Sonia Bashir
Assistant Professor, Department of Urdu, University College for Women, Abdul Wali Khan University, Mardan

Abstract:
The society depicted in Ahmed Nadeem Qasmi's stories has a distinctly progressive background. In this society, the self-respect of the poor people has been continuously undermined by the rich and feudal class. Majority of characters in these stories does not have a respectable position in the society. The real names of these poor people are distorted and they are addressed in a contemptuous manner. In this research paper, in the light of Ahmed Nadeem Qasmi's short stories, the social and economic reasons that lead to the undermining of the self-esteem of the poor sections of the society have been discussed in detail. Ahmad Nadeem Qasmi has portrayed life in his short stories with such realism that the human beings depicted in them are not lifeless; rather, they breathe and exist vividly. They either perceive their personal dignity themselves or the storyteller presents their wounded dignity in such a way that readers are compelled to reflect upon it. This, in turn, makes them intensely aware of the inequalities present in society.

Keywords: Ahmad Nadeem Qasmi, short Stories, Progressivism, class differentiation, self-respect, Society, Humiliation, analysis.

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں فن اور فکر دونوں اعتبار سے توازن بدوش ارتقا تسلسل کے ساتھ موجود ہے۔ انھوں نے ترقی پسندی کو مارکسزم تک محدود کرنے کی بجائے اس کے دامن میں انسان دوستی کے متنوع رنگ شامل کر کے اسے پر کشش بنانے کی کوشش کی۔ ان کا فن نصف صدی سے بھی طویل قصہ ہے بلکہ فکری کینوس کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کے فن کے کینوس میں رہتا بستا انسان دوسری جنگ عظیم سے لے کر نائن الیون تک پوری قوت اور توانائی کے ساتھ سانس لیتا ہے۔ اور چونکہ یہ انسان ازل اور ابد کے ساتھ نہ ٹوٹنے والے معنوی رشتے کی بنیاد پر منسلک ہے، تو ایسی صورت میں اس انسان کا کینوس صدیوں تک پھیل جاتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے سینکڑوں افسانے لکھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نہ تو ان کی زبان خارجی جبر کے زیرِ اثر خاموش ہوئی اور نہ ہی ان کے دل و دماغ میں کہانی کے سوتے خشک ہوئے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے خیال میں تقسیم ہند کے بعد بیشتر افسانہ نگار یا تو خاموش ہو گئے یا تجربات کا خزانہ خالی ہونے کی وجہ سے ان کی تحریریں زوال کا شکار ہو گئیں اور اسی زمانے میں احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری سن بلوغ کو پہنچتی ہے۔(۱) تقسیم ہند کے بعد سرحد کے دونوں پار ترقی پسند تحریک پر پابندی لگی لیکن احمد ندیم قاسمی اس کے

باوجود نہ تو مصلحتوں کا شکار ہوئے اور نہ ہی اپنے موقف سے پیچھے ہٹے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی کہانیاں ترقی پسندیت کے اعتبار سے جذباتی نعرہ بازی، انقلاب کے باغیانہ پرچار یا پروپیگنڈے سے خود کو بچاتی ہوئی ان کے تصورِ فن کے آغوش میں سمٹ کر خود کو پیش کرتی ہیں۔ اور نظریے کے ساتھ بچگانہ یا غیر تخلیقی تعلق استوار کرنے کی بجائے زندگی کے ساتھ دانشورانہ ربط پیدا کرنے پر یقین رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق کا اس ضمن میں ماننا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے ہاں کسی خاص سیاسی فلسفے کی تبلیغ اور اس پر اصرار نہیں ملتا بلکہ وہ اپنی کہانیوں میں زندگی کے تجربات کو سچائیوں کے ساتھ پیش کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔(۲)

احمد ندیم قاسمی نے افسانوں میں زندگی کی جو تصویر سچائیوں سمیت پیش کی ہے، اس میں دکھائی دینے والے انسان بے جان نہیں ہیں بلکہ سانس لیتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی اور شخصی وقار کو یا تو خود محسوس کرتے ہیں یا کہانی کار ان کے مجروح ہوتے ہوئے وقار کو کچھ ایسے انداز سے پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والے سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور سماج کی اس ناہمواری کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس عمل کے ذریعے وہ سماج کی ترجمانی دانشورانہ پس منظر کے ساتھ پیش کرنے میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری کے بقول وہ اپنے افسانوں کے ذریعے لوگوں کے سامنے ایک آئینہ بھی رکھ دیتے ہیں جس میں ان کی خوبیاں اور خامیاں نمایاں ہو جائیں اور ایک معیار بھی جہاں تک انہیں پہنچنا ہے۔(۳) اس معیار کا تعین ان کے ترقی پسندانہ منشور کی روشنی میں ہوتا ہے جس میں مذہب، انسان دوستی اور طبقاتی تفریق سے نجات کی خواہش ساتھ ساتھ موجود ہوتی ہے۔ ان کی خواہش ہی یہی ہے کہ طبقاتی تفریق کا خاتمہ ہو جائے، تو سماج میں رہنے بسنے والے انسان عزت نفس بحال رکھتے ہوئے سانس لینے کے قابل بن جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قمر رئیس کے بقول قاسمی صاحب طبقاتی جبر و ظلم سے انسان کی آزادی کو سیاسی آزادی سے کم اہمیت نہیں دیتے۔(۴) طبقاتی تفریق سے نجات میں فرد کی عزت نفس کے تحفظ اور وقار کی بحالی کا راز پوشیدہ ہے۔ قاسمی صاحب نے اپنے افسانوں میں ذلتوں کے مارے ان لوگوں کی تلخ تصویر اس لیے دکھائی ہے کہ قارئین کو زندگی کے اس رخ سے نفرت ہو جائے اور زندگی اور سماج دونوں اپنی اصلاح کے قابل بن جائیں۔ روٹی اور جنس کے علاوہ انسان کی ایک انتہائی اہم ضرورت شخصی وقار اور عزت نفس کا تحفظ بھی ہے۔ انسان اس عزت نفس کو خاندان، دولت یا ذہانت کے ساتھ نتھی کر کے بھی اسے سہارا دیتا ہے اور اخلاق اور مذہب کا سہارا لے کر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح اسے بھوکا رکھنا یا جنسی ضرورت پوری کرنے کے قانونی یا ثقافتی حق سے محروم رکھنا ظلم ہے۔ اسی طرح اس کے شخصی وقار کو مجروح کرنا بھی روحانی اعتبار سے بہت بڑا ظلم ہے۔ جس سے انسان کی تذلیل ہوتی ہے۔ تذلیل کے لیے انگریزی میں Humiliation کا لفظ مستعمل ہے۔ میریم ویبسٹر ڈکشنری میں Humiliation کے معنی درج ذیل ہیں۔

> To reduce (someone) to a lower position in one's own eyes or others' eyes: to make (someone) ashamed or embarrassed.(۵)

یعنی کسی انسان کی تذلیل کا مفہوم یہ ہے کہ اسے اس کی اپنی یا دوسروں کی نظروں میں گرایا یا شرمندہ کیا جائے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں انسانوں کی تذلیل کا حوالہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ قاسمی انسانی تذلیل کو سماجی، اقتصادی اور سیاسی پس منظر میں ابھار کر انسان دوستانہ پیغام کو بالواسطہ انداز سے قارئین تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ قاسمی کے افسانوں میں ایسے کردار بہ کثرت موجود ہیں جن کی کہیں جذباتی اور کہیں روحانی سطح پر مسلسل تذلیل ہوتی ہے اور کہیں پر جسمانی تشدد اس تذلیل کی شدت کو نمایاں کرنے کے لیے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ قاسمی کے افسانوں میں ان جملوں کی کاٹ

جو کسی جاگیر دار، وڈیرے، سرمایہ دار یا استحصال کے روپ میں جلوہ گر کسی بھی انسان کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، جسمانی تشدد کے مقابلے میں بھی زیادہ ہے۔ مثلاً افسانہ "جان ایمان کی خیر" میں ہیڈ ماسٹر اسکول استاد کی بے عزتی اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ مسلسل بیماری کی وجہ سے غیر حاضر ہے۔ اسکول استاد انور خان اپنی کمزوری اور بیماری کا ذکر کرے اپنی پنڈلیاں دکھاتا ہے۔ تو ہیڈ ماسٹر بڑے تذلیل آمیز انداز میں کہتا ہے:

> "آفرین ہے آپ پر ۔۔۔ باہیں اور پنڈلیاں تو دکھا دیں۔ اب لگے ہاتھوں اپنے روحانی فرزندوں کے سامنے دھوتی بھی اتار دیں تاکہ یہ اچھا سبق سیکھیں۔ ماسٹر صاحب آپ کی ذات کیا ہے۔"(۶)

ہیڈ ماسٹر کا آخری جملہ سماج میں موجود اس تلخ حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے جس کی وجہ سے سماج کی ایک مخصوص آبادی ہر دور میں پیدائشی گنہگار پیدا ہوتی رہی ہے۔ ان کی ذات ان کے لیے سب سے بڑی گالی ہوتی ہے۔ اور کسی کی ذات پر شک کرنا دراصل اسے حقارت کی نظر سے دیکھنا ہے۔ ذات میں انسان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اور ذاتوں کے حوالے سے عزت اور ذلت کے پیمانے انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ ذات پات کے اثرات اس حد تک گہرے ہیں کہ ہندوؤں کو چھوڑ کر مسلمان معاشرے میں بھی پیشوں کے حوالے سے طبقات اور ذاتوں کا سلسلہ پایا جاتا ہے۔ جس معاشرے میں ذات ایک گالی ہو، تو ایسے معاشرے میں انسان کو اس کے کردار کی بنیاد پر نہیں ٹٹولا جاتا۔ ہیڈ ماسٹر کا ذات کا پوچھنا اس کی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ ایسے میں ماسٹر انور خان کا جواب ملاحظہ کیجیے۔

> "آپ میری ذات پوچھتے ہیں، میں انسان ہوں ۔۔۔ سمجھے آپ؟ اور یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ مجھے آپ ایسے حیوان کے تحت کام کرنا پڑا۔ مجھے اس ملازمت کی ضرورت نہیں، جہاں انسان جوتا بن کر رہ جائے۔ جب چاہا پہن لیا، جب چاہا اتار پھینکا۔ جب چاہا ۔۔"(۷)

عزت نفس بحیثیت انسان ایک اہم سماجی ضرورت ہے۔ کوئی بھی انسان یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی دوسرے انسانوں کے سامنے یا اکیلے میں بے عزتی ہو اور پھر اپنے گھر والوں، اولاد یا شاگردوں کے سامنے ایسی ذلت انسان کو اندر سے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ یہی وجہ کہ عزت کی خاطر انسان اپنا بہت سارا نقصان بھی کر دیتا ہے لیکن عزت پر سودا کرنے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں ہوتا۔ ماسٹر انور خان کے روپ میں بھی احمد ندیم قاسمی نے یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ "سانولا" میں بھی ایک مقام پر یہ نکتہ سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ سانولے کو کوئی بھی اپنی لڑکی دے کر داماد بنانے کے لیے تیار نہیں ہے اس لیے کہ وہ چمارن کا بیٹا ہے۔

اسی طرح کی کیفیت افسانہ "افق" میں ملتی ہے۔ افسانے کے ایک کردار کی زبانی قاسمی صاحب پیغام دیتے ہیں کہ محبت کر کے اختر نے کوئی جرم نہیں کیا۔ تو پھر اختر کا جرم کیا ہے؟ اس کا جرم یہ ہے کہ وہ ایک مفلس باپ کا یتیم بیٹا ہے۔ اس کی ماں بھی غریب ہے جو اپلوں کا دھواں پیتے پیتے دمے کی شکار ہونے والی ہے۔ وہ خود بھی ایک کلرک ہے جسے اس کا سیکرٹری اکثر گدھا کہہ کر پکارتا ہے ۔(۸) انسانی معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ چاہے کھیت کلیان ہو، یا کوچہ و بازار، حجرہ ہو، مسجد ہو یا مندر۔ ہر جگہ تمام انسان برابری کی بنیاد پر اکٹھے نہیں ہوتے بلکہ اپنے تعصبات، جہالت اور انا کی کسی نہ کسی حوالے سے تسکین کی خاطر اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دفتروں، بازاروں، عدالتوں اور گلی کوچوں میں جہاں کہیں انسان اکٹھے ہوتے ہیں، سماجی اور طبقاتی تفریق کی بنیاد پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ چھوت

چھات محض ایک مذہبی مسئلہ نہیں بلکہ سماجی مسئلہ بھی ہے اور طبقاتی بھی۔ غریب نوجوان اختر کو دفتر میں گدھا کہہ کر پکارنے کا عمل تعلیم یافتہ اور مہذب معاشرے میں جاہلانہ یا انانیت پسندانہ رویے کا مظہر ہے۔

انسانوں کی تذلیل کے حوالے احمد ندیم قاسمی کے دیگر کئی ایک افسانوں میں بھی موجود ہیں۔ ان کہانیوں میں احمد ندیم قاسمی اپنے نمائندہ کرداروں یا بالفاظ دیگر ہمزاد کرداروں کے ذریعے ان انسان دشمن قوتوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں، جو اپنے جیسے لیکن غریب انسانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتے ہیں۔ افسانہ "لارنس آف تھیلیبیا" میں بڑے ملک صاحب کا کردار بھی کچھ اس قسم کا ہے۔ مسکین جو ایک غریب نوجوان ہے اور پیشے کے اعتبار سے جولاہا ہے۔ اس کی غلطی محض اتنی ہے کہ چوپال میں اس نے بڑے ملک کو اتنا کہا ہے کہ ملک صاحب تہہ بند سنبھالو، ننگے ہو رہے ہو۔ اس کی اس گستاخی کی سزا اسے گھونسوں، مار پیٹ اور گالیوں کی صورت میں ملتی ہے۔

کہانی کے ایسے کرداروں کے ذریعے کہانی کار انسان دوستی کا رنگ ابھارنے کے لیے مذہبی حوالہ بھی لے آتے ہیں۔ مثلاً چھوٹے ملک خدا بخش اس کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ وہ بڑا کاریگر آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی ہے لیکن بڑا بھولا ہے۔ اصل نام مسکین ہے لیکن لوگ سکین سکین کے نام سے بلاتے ہیں۔(۹) اس کی شخصیت کے ان حوالوں کے ذریعے بڑے ملک کی وحشیت اور مسکین کی معصومیت کو فنکارانہ انداز سے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جس کے نتیجے میں انسان دوستانہ رنگ کو گہرا کرنے میں مدد ملی ہے۔ کہانی میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ غریب انسانوں کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کے اصل نام بگاڑے جاتے ہیں۔ نام بگاڑے جانے کا حوالہ افسانہ "اصول کی بات" میں بھی ہے۔ کہانی میں ایک غریب مزارع اپنا نام عبداللہ بتاتا ہے تو زمیندار اس کا نام بگاڑ کر کہتے ہیں کہ "دلا" کہا کرو۔ اور پھر اس کی کہانی کے اختتام تک زمیندار عبداللہ کو "دلا" پکارتا ہے۔

قاسمی صاحب کے افسانوں میں طبقاتی تفریق کے خلاف کہیں زیریں سطح پر تو کہیں بالائی سطح پر احتجاج کی کیفیت ملتی ہے۔ ان کے خیال میں انسان مرنے کے بعد بھی برابر نہیں ہوتے بلکہ موت کے بعد غریبوں اور امیروں کے ماتم میں فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ دنیا دولت کے سامنے سربسجود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں یا شہر میں کسی امیر کی موت سارے گاؤں اور شہر پر ماتمی کیفیت طاری کر دیتی ہے جو طویل دورانیے تک رہتی ہے اس کے برعکس غریب کی موت تالاب میں گرتے ہوئے کنکر کی مانند ہوتی ہے، جس کی وجہ سے پانی کی سطح پر لہریں پھیل جاتی ہیں اور تھوڑی دیر بعد پانی ساکن ہو جاتا ہے۔ افسانہ "کپاس کا پھول" میں ایک مقام پر اس فرق کو انسان دوستانہ تناظر میں ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قاسمی صاحب کے بقول:

"بعض موتیں کتنی آباد اور بعض کتنی ویران ہوتی ہیں۔ خود راحتاں کا ننھا بھائی کنویں میں گر کر مر گیا تھا تو کیا شاندار ماتم ہوا تھا۔ کئی دن تک بین ہوتے رہے تھے اور گھر سے باہر چوپال پر دور دور سے فاتحہ خوانی کے لیے آنے والوں کے ٹھٹ لگے رہے تھے اور پھر انہی دنوں کریمے نائی کا بچہ نمونیے سے مرا تو بس اتنا ہوا کہ اس روز کریمے کے گھر کا چولھا ٹھنڈا رہا۔ اور تیسرے ہی روز وہ چوپال پر بیٹھا چوہدری فتح دین کا خط بنا رہا تھا۔ موت میں ایسا فرق تو نہیں ہونا چاہیے۔ مر کر تو سب برابر ہو جاتے ہیں۔ سب مٹی میں دفن ہوتے ہیں"(۱۰)

قاسمی صاحب نے اپنی کہانیوں کے ذریعے یہ حقیقت آشکارا کی ہے کہ غریبوں کے کچے گھروں میں انسانیت موجود ہو سکتی ہے جو ہمیں فاصلوں سے نظر نہیں آتی لیکن قریب کا مشاہدہ کرنے سے یہ حقیقت کھلتی ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت افسانہ "کفارہ" میں بھی ہے۔ پیرو کے والد کی بیماری پر خرچہ ہوتا ہے تو کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ زمینیں بنجر ہو جاتی ہیں اس لیے کہ ہل چلانے کے لیے بیلوں کا جوڑا باپ کی بیماری کی نظر ہو گیا۔ پیرو اپنا گھر بیچ کر بیلوں کا جوڑا خریدتا ہے لیکن جب شام ہوتی ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے پاس ان قیمتی

بیلوں کو ٹھہرانے کے لیے جگہ بھی نہیں ہے۔ ایسے میں کوئی صاحب جائیداد اس کے کام نہیں آتا جس سے کہہ کر وہ اپنے بیلوں سمیت وہاں پر رہائش اختیار کر لے۔ اس کی نظر غریب دھوبیوں کے گھر پر پڑتی ہے اور وہ کموں، اس کے چھوٹے بھائی اور ماں کے ساتھ ان کے گھر پر رہائش اختیار کر لیتا ہے۔ سماج کی نظر میں ایک صاحب جائیداد شخص کا غریب دھوبن کے گھر رہنا معیوب عمل ہے اور وہ بھی اس حوالے سے ہچکچاہٹ سے کام لے رہے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ ایک زمیندار کا بیٹا کیسے ان کے گھر میں ان کے ساتھ رہ سکے گا۔ پیروان کے اس خدشے کو بھانپ کر کہتا ہے:

> "یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ ہم سب مسلمان ہیں اس لیے ہم سب ایک ہیں۔ میں نے ایک درخواست کی ہے۔ تم مان لو تو میں تمہیں دعا دوں گا۔ اور اگر تم نہ مانو تو خدا کی اتنی کھلی زمین تو ہے ہی۔ بسر کر لوں گا۔ میں تو اپنا گھر سمجھ کر تمہارے ہاں آ نکلا تھا۔"(۱۱)

وہ تھوڑا ہی عرصہ گزارنے کے بعد ان سے مانوس ہو گیا اور ان کی محبت کے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ پھر اس کے بعد اسے ایک اور ذہنی عذاب سے دوچار ہونا پڑا۔ اسے کموں سے اور کموں کو اس سے محبت ہو گئی۔ وہ سوچتا کہ اگر اس نے کموں کے ساتھ شادی کی تو اس کے برادری کے لوگ کیا سوچیں گے۔ اس مقام پر وہ محسوس کرتا ہے کہ آخر انسانوں میں جماعت بندیاں کیوں ہیں۔ محبت کی راہ میں سماج اور گاؤں کو حائل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔(۱۲)

یوں دیکھا جائے تو اس کہانی میں انسان دوستانہ رنگ موجود ہے۔ پیرو مجبوری کی وجہ سے ان کے گھر میں ٹھہر جاتا ہے اور پھر ان کی خدمت اور بے پناہ خلوص کے سحر میں مبتلا ہو کر ان کا ہو جاتا ہے اور کہانی کے اختتام پر وہ ان کے لیے اپنی زندگی کی قیمتی متاع لٹانے کے لیے بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی ہمیں بتاتی ہے کہ محبت اور ایثار کی کوئی سرحد نہیں ہوتی اور نہ وہ کسی طبقے تک محدود ہوتی ہے۔ دھوبی سماج کی نظر میں ذلیل سمجھے جاتے ہیں لیکن کہانی کی روشنی میں وہ ایک ضرورت مند زمیندار کو پناہ دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ قاسمی کے افسانے "الحمد للہ" میں غریب مولوی ابوالبرکات کی قدر کرنے والے لوگ چودھری فضل داد کی صورت میں موجود ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ سماج میں کا وہ منفی روپ بھی ہے جو قلاش مولوی ابوالبرکات کو مولوی ابل بنا دیتا ہے۔

غربت کا منفی اثر بچوں کے اخلاقیات پر بھی پڑتا ہے۔ بچوں کی تربیت اس انداز سے کی جاتی ہے کہ انہیں بے جا انکساری اور خوش اخلاقی سے کام لینا پڑتا ہے۔ "رئیس خانہ" میں جس گاؤں اور ماحول کی عکاسی کی گئی ہے وہ سیکسر کا خوبصورت پہاڑی علاقہ ہے جہاں متمول لوگ بچوں سمیت سیر سپاٹے کے لیے آتے جاتے رہتے ہیں۔ مقامی بچوں کی تربیت یہ کی گئی ہے کہ وہ امیروں اور ان کے بچوں کو سلام کیا کریں۔ دیکھا جائے تو اخلاقی اعتبار سے کسی کو سلام کرنے میں پہل کر لینا نیکی کا کام ہے لیکن یہاں پس منظر مختلف ہے۔ جب سلام محض غریب بچوں کی طرف سے ہو اور کسی امید کی لو دل میں جلائے ہوئے ہو تو ایسی صورت میں نیکی کا یہ کام بھی بچوں کی خودداری کے منافی ٹھہرتا ہے اور ان کی تذلیل کا باعث بنتا ہے۔ افسانہ نگار اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "جب امیر بچے کاروں سے اترتے اور اتفاق سے ان کی نظر گیٹ کی طرف اٹھ جاتی تو چند جری قسم کے غریب بچے فوراً سلام کرتے۔ ادھر سے سلام کا جواب مل جاتا تو وہ شرمیلے اور بزدل بچوں کو فخر سے دیکھتے اور کہتے "دیکھا ہمیں سلام کا جواب ملا ہے۔ اب ہمیں بلے اور گیندیں اور پرانے بوٹ ملیں گے انعام میں اور تم بیٹھے دیکھا کرنا۔ سو رو بڑے آدمیوں کو جھک کر سلام کرنا چاہیے، ثواب ملتا ہے۔"(۱۳)

یہ حوالہ بتاتا ہے کہ سلام کا جواب باقاعدگی سے نہیں ملا کرتا تھا اور پرانے بوٹ اور گیندیں اور بلے ملنے میں محض اتفاق اور قسمت کا عمل دخل تھا۔ ان کے بڑوں کا بھی یہ حال تھا کہ چند لوگ عالی جناب ڈپٹی کمشنر صاحب کو سلام کا فخر حاصل کرنے کے لیے آتے۔ اخلاقیات کے یہ حوالے مجبوری اور غربت کی پیدا کردہ ہیں اور فقیرانہ اور غلامانہ ذہنیت کی پیداوار ہیں جس کے نتیجے میں انسانی مساوات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اقدار کا جنازہ اٹھتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے بین السطور اخلاقیات کے ان معیارات کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

صنفی اعتبار سے انسانی تذلیل کا حوالہ افسانہ "چھلی" میں پایا جاتا ہے۔ کہانی کی روشنی میں سڑک کے کنارے جب داری اور اس کا باپ بیٹھتے ہیں تو روازنہ موٹر سائیکل پر سوار دو لڑکے ان کو تنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ اس غریب باپ سے اس کی بیٹی کی قیمت پوچھتے ہیں۔ ان کا رویہ کافی ہتک آمیز ہوتا ہے۔ غریب باپ ان کو سبق سکھانا چاہتے ہیں لیکن ان کو ملک کے اندر موجود انصاف کے نظام کا پتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس خوف سے کچھ زیادہ نہیں کہتا کہ اگر وہ پکڑا گیا تو اس کی اکیلی بیٹی کا کیا ہوگا۔ نوجوانوں کا حقارت آمیز اور جنسی ہراسانی داری کی تذلیل کی نشاندہی کرتے ہیں۔

قاسمی صاحب نے اپنے افسانوں میں انسان کی انسانیت کو بنیادی قدر کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ "میرا دیس" میں کہانی کا مرکزی کردار جو ایک غریب مزارع کی بیٹی ہے اپنے ساتھ ہونے والے جذباتی، احساساتی، جسمانی اور اقتصادی استحصال اور تذلیل کو دیکھتی ہے۔ اسے پتہ ہے کہ ہم سب انسان ہیں لیکن اسے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ انسان ہوتے ہوئے بھی زمیندار کی بیٹی کے مقابلے میں کمتر ہے۔ اس لیے کہ وہ مالکن ہے اور وہ ایک غریب مزارع کی بیٹی ہے۔ وہ مولوی صاحب کی طرف سے کیے جانے والے وعظ پر بھی سوچتی ہے جس نے کہا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں اور تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ بھائی بھائی ہونے کے باوجود وہ یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے باپ اور زمیندار میں فرق ہے۔ زمیندار اس کے باپ کو گھرک سکتا ہے لیکن اس کا باپ زمیندار کو گھرکنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

اس کا باپ زمیندار کے لیے جنگل سے لکڑیاں لاتا ہے اس کے حکم پر اسکے در پر حاضری دیتا ہے اور زمیندار کی بیٹی اسے پنگھٹ سے گاگر بھرنے کے لیے بھیجتی ہے اس لیے کہ اسے نہانا ہے۔ جو عزت زمیندار کی بیٹی کو حاصل ہے وہ اسے حاصل نہیں۔ اسے مویشیوں کے لیے چارہ بھی لانا ہے۔ والدین کی خدمت بھی کرنی ہے۔ اپنا جسم اور اپنی جوانی زمیندار پر نچھاور کرنی ہے اس لیے کہ وہ آقا ہے اور اس نے ایک بیگھہ زمین اس کے باپ کو کاشت کے لیے دے رکھی ہے۔ اسے گاؤں کے چھوکروں کا بھی سامنا کرنا ہے اور گاگر کو صحیح سلامت واپس لانا بھی ہے اگر کسی چھوکرے نے اس کے گاگر کو کنکر سے نشانہ بنایا تو سوال اس کے کردار پر بھی اٹھے گا اور اسے سبکی بھی برداشت کرنی پڑے گی۔ وہ زمیندار کی زبان سے اپنے باپ کے لیے نازیبا قسم کے کلمات بھی سنتی ہے۔ زمیندار اس سے کہتا ہے کہ تم ذرا بن سنور کر آیا کرو اور گھاس کاٹنے کے لیے اس بوڑھے خچر کو بھیجا کرو۔ (۱۴) یوں کہانی کا مزاج یہ بتاتا ہے کہ تمام انسان برابر نہیں ہیں۔ خدا نے بھی زمیندار اور عام مزارع میں فرق کو روا رکھا ہے۔ کہانی کی روشنی میں زمین پر ذلتوں کے مارے لوگ بھی سانس لینے پر مجبور ہیں جن کی بحیثیت انسان کوئی قدر نہیں کی جاتی۔ اس قسم کی کیفیات اور مسائل کی نشاندہی کر کے قاسمی صاحب نے غریبوں کے مسائل کو سامنے لانے اور احترام آدمیت کا حوالہ ابھارنے کی سعی کی ہے۔

انسان کے ہاتھوں انسان کی تذلیل ایک ایسا رویہ ہے جو انسانی اقدار کے خلاف ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ معاشرے میں یہ رویہ موجود ہے۔ ہمارے سماج میں تقسیم در تقسیم کا سلسلہ موجود ہے۔ ہندوازم، سکھ اور اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب بھی ہیں جن کا

وجود اس خطے میں موجود رہا ہے۔ افسانہ پر میشر سنگھ میں اس تفریق کو انسانی بنیادوں پر مٹانے کی بات کی گئی ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے کا صرف یہی ایک المیہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی تفریق و تقسیم کے قاعدے موجود ہیں۔ ہندومت میں سماج کی طبقاتی تقسیم کا حوالہ موجود ہے۔ جس کی رو سے معاشرے کو چار ذاتوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ اسلام کے پیروکاروں میں بھی مذہبی اعتبار سے تقسیم در تقسیم کا حوالہ پایا جاتا ہے۔ اس میں ایک تو خالص مذہبی تقسیم و تفریق ہے جس کی روشنی میں مختلف فرقوں کا وجود موجود رہا ہے اور ان کے آپس میں اختلافات مذہبی مناقشوں اور ایک دوسرے سے نفرت حتی کہ خونی جھگڑوں پر بھی منتج ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرے کا سکون غارت ہوتا ہے اور انسانیت کی بنیاد پر کسی انسان کو تولنے کی بجائے سابقوں اور لاحقوں کے ذریعے اس کی حیثیت کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تقسیم و تفریق کا ایک اور حوالہ ذات اور برادری بھی ہے اور ان سے زیادہ خطرناک پیشوں کے اعتبار سے کسی کی سماجی پوزیشن کا تعین کرنا ہے۔ نائی، بڑھئی، موچی، میراثی وغیرہ کی تقسیم نے بھی انسانوں کے درمیان فاصلے پیدا کرنے، خالص انسانی بنیادوں پر اقدار کا تعین کرنے اور اس کی روشنی میں سماج میں رہن سہن کو خوشگوار بنانے میں دشواریاں پیدا کی ہیں۔ افسانہ موچی میں بھی ایسے ہی رویوں کو بنیاد بنانے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے اپنے کردار بابا اللہ بخش کی زبانی کہا ہے کہ نادر اگر موچی ہے تو کیا ہوا۔ یہ بڑی چھوٹی بات ہے کہ تمہیں جوتا گانٹھ کر دے اس سے یہ کہو کہ اب جوتا چاٹو بھی۔(۱۵) اسی طرح نادر کی ماں اپنے بیٹے کو سمجھاتی ہے کہ اسے رونا نہیں چاہیے اس لیے کہ اس سے آنکھوں کی بینائی جاتی ہے۔ اور موچی کی بینائی نہ رہے تو کوئی بھیک بھی نہیں دیتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اندھا نہیں ہے بلکہ اندھا بننے کی کرتب دکھا رہا ہے۔(۱۶) اس کہانی میں راجہ کی زبانی یہ کہا گیا ہے کہ نئے تھانیدار کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ملزم یا قاتل خاندانی ہے یا کمین ہے۔ نور دادا کے بقول نئے تھانیدار کو چاہیے کہ وہ ہر کسی کو ایک لاٹھی سے نہ ہانکا پھرے۔ جس کے جواب میں راجہ کہتا ہے کہ میں یہ بات کپتان کے کان میں ڈال دوں گا۔(۱۷) ان تمام حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ قانون کی بنیاد انسانی بنیادوں پر نہیں ہے جس کی رو سے سب برابر ہوں بلکہ نور دادا اور راجہ شیر خان جیسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ایک قتل کو یوں ننگا نہیں کرنا چاہیے۔ راجہ شیر خان نہ صرف موچی نادر کا مذاق اڑاتا ہے بلکہ اس کا جذباتی اور معاشی استحصال بھی کرتا ہے جو مقام انسانیت سے گری ہوئی باتیں ہیں۔ ان تمام باتوں سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ معاشرے میں قانون، اقدار اور مقررات کی انسانی بنیادوں پر تشکیل نو ضروری ہے اس کے بغیر معاشرے کا ایک مخصوص طبقہ اپنے عمل کی بجائے محض خاندانی ہونے کی بنیاد پر فوائد بٹورے گا۔ نادر جیسا غریب موچی اپنا استحصال اپنی آنکھوں سے دیکھے گا لیکن کوئی اس کا پوچھے گا تک بھی نہیں۔ ایسے غریب طبقات اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے ہنرمندوں کی سرعام بے عزتی کا سلسلہ جاری رہے گا اور ان کا استحصال ہوتا رہے گا جس کی وجہ سے وہ اپنی بنیادی آرزوؤں کو عملی جامہ پہنانے کی بجائے قیمتی جوتے تیار کر کے محض راجہ شیر خان کے پیروں کی زیب و زینت بڑھاتے رہیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، انڈیا، ۲۰۰۲ء، ص:۲۰۰

۲۔ محمد صادق، ڈاکٹر، ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ، اُردو مجلس دہلی، ۱۹۸۱ء، ۱۷۶

۳۔ اسلوب احمد انصاری، احمد ندیم قاسمی اور اُردو افسانہ، مشمولہ، ندیم نامہ، ملتان، ۱۹۷۶ء، ص:۲۱۷

۴۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، تلاش و توازن، ادارہ خرام پبلیکیشنز، حوض قاضی، دہلی، انڈیا، ۱۹۶۸ء، ص:۲۰۱

5 https://www.merriam-webster.com/dictionary/humiliate

۶۔ احمد ندیم قاسمی، جان ایمان کی خیر، مشمولہ آنچل، مجموعہ احمد ندیم قاسمی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص:۱۵

۷۔ ایضاً، ص:۱۵

۸۔ احمد ندیم قاسمی، افق، ایضاً، ص:۱۳۸

۹۔ احمد ندیم قاسمی، لارنس آف تھیلیبیا، مشمولہ کپاس کا پھول، مجموعہ احمد ندیم قاسمی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۸ء، ص، ۳۶۰

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، کپاس کا پھول، ایضاً۔ ص:۳۱۶

۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، کفارہ، مشمولہ کوہ پیما۔ ایضاً، ص:۴۴۹

۱۲۔ ایضاً۔ ص:۴۵۳

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، رئیس خانہ، مشمولہ، سناٹا، مجموعہ احمد ندیم قاسمی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸ء، ص:۶۵۳

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، میر ادیس، مشمولہ، طلوع وغروب، مجموعہ احمد ندیم قاسمی، ایضاً، ص:۶۸۷

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، موچی، مشمولہ، بازارِ حیات، مجموعہ احمد ندیم قاسمی، جلد اول، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۸ء، ص:۲۷۲

۱۶۔ ایضاً، ص:۲۷۵

۱۷۔ ایضاً، ص:۲۷۷

References in roman script:

1. Khalil-ur-Rehman Azami,Urdu May Taraqqi Pasand Adabi Tehreek,Aligarh India, educational book house , 2002,P:200
2. Dr. Muhammad sadiq, Taraqqi Pasand Tehreek Aur Urdu Afsana, Delhi, Urdu Majlis,1981, P:176
3. Asloob Ahmad Ansari, Ahmad Nadeem Qasmi awr Urdu Afsana, Mashmoola , Nadeem Nama, multan,1976,P:217
4. Dr. Qamar Raees, talash o tawazun, hawaz e qazi, delhi, India,idara khurram publications,1968 P:201
5. https://www.merriam-webster.com/dictionary/humiliate
6. Ahmad Nadeem Qasmi,jaan emaan ki khair,mashmoola, Anchal, majmoogha e Ahmad Nadeem qasmi, jild awwal , Lahore, sang e meel publications,2008,P:15
7. Ibid, P:15
8. Ahmad Nadeem Qasmi, ufaq, Ibid, P:138

9. Ahmad Nadeem Qasmi,larans of Thelibia , Mashmoola Kapaas ka Phool, Majmoogha e Ahmad Nadeem Qasmi, Jild Doom , Lahore, Sang-e-Meel publications,2008,P:360
10. Ahmad Nadeem Qasmi, Kapaas Ka Phool, Ibid, P:316
11. Ahmad Nadeem Qasmi,Kafara , Mashmoola Koh Pema,Ibid, P:449
12. Ibid, P:453
13. Ahmad Nadeem Qasmi, Raees Khana, Mashmoola Sannata , Majmoogha Ahmad Nadeem Qasmi, Jild Awwal , Lahore, Sang-e-Meel Publications,2008,P:653
14. Ahmad Nadeem Qasmi,Mera Dais , Mashmoola Taloogh-o-ghuroob,Majmoogha -e -Ahmad nadeem qasmi, jild doom ,Ibid,P:687
15. Ahmad Nadeem Qasmi, Mocha, Mashmoola Bazaar-e-hayat , majmoogha e Ahmad Nadeem Qasmi, Jild Awwal ,Ibid,P:272
16. Ibid, P:275
17. Ibid, P:277